اس کی روشنی میں ہر صاحبِ علم یہ جان سکتا ہے کہ احادیث کی قوت و ضعف کا فیصلہ کن وجوہ و دلائل کی بنا پر کیا گیا ہے اور وہ کس حد تک وزنی اور مضبوط ہیں۔ اگر محدثین کے اس محیّر العقول کارنامے کے بغیر احادیث کا ملا جلا ذخیرہ ہم تک پہنچتا اور ہمارے پاس صحیح کو غیر صحیح سے ممیّز کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو یہ امر بلا شبہ باعثِ تشویش ہو سکتا تھا۔ لیکن موجودہ صورت میں پریشانی کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ پھر مزید موجبِ اطمینان امر یہ ہے کہ جن احادیث کی صحت یا ضعف پر امت کی اکثریت کا اتفاق ہے، ان کی تعداد ان احادیث کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ ہے جن کی صحت و عدمِ صحت کا معاملہ مختلف فیہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص تھوڑی مقدار کو مشتبہ سمجھ کر پورے ذخیرے کو ساقط الاعتبار قرار دے دے تو اس کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہوگی جو اپنے خزانے کے چند سکّوں کو کھوٹا پا کر پورا خزانہ دریا برد کر دے یا بازار میں چند جعلی نوٹوں کا چلن دیکھ کر پورے ملک کی کرنسی کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کرے۔ کیا کوئی زیرک و ہوشمند انسان ایسا ناعاقبت اندیشانہ اقدام کرنے کا تصوّر بھی کر سکتا ہے؟

ترجمان القرآن کا "منصبِ رسالت نمبر"

فتنۂ انکارِ حدیث اور منکرینِ حدیث کے تمام دلائل کا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مدلّل و مسکت جواب۔

دفتر میں صرف چند پرچے موجود ہیں۔ جن کو ۲/۵۰ روپے کی بجائے صرف دو روپے میں معہ خرچہ ڈاک منگوایا جا سکتا ہے۔

مینجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

اسلام اور سیاست

علّامہ محمد اسد

جدید مغرب کی ذہنی فضاء میں یہ بات قریب قریب بداہت کے درجے کو پہنچ چکی ہے کہ کسی بھی مذہب کو سیاسی زندگی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، جبکہ لادینیت کا اصول فی نفسہٖ ترقی کا ہم معنیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ عملی سیاست کو مذہبی نقطۂ نظر سے جانچنے پرکھنے کی ہر کوشش رجعت پسندی قرار دے کر بلا ادنیٰ تامل مسترد کر دی جاتی ہے۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، اُسے پسِ منظر میں رکھ کر میں اس بحث میں دونوں نقاطِ نظر میں سے کسی ایک کی بھی حمایت نہیں کرنا چاہتا، البتہ اس مضمون میں، مَیں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ مذہب و سیاست کے مابین جُدائی کا اصول چاہے مغرب کی سماجی اور سیاسی ضروریات کے اعتبار سے مستحکم ہو یا نہ ہو، اسلام اور عالمِ اسلام کے لحاظ سے یہ اصول فطرتاً نہایت بودا ہے۔

اس لیے ہمارے سامنے موضوعِ زیرِ بحث یہ نہیں ہے کہ سیاست کو دین کے تابع رکھنے کا ناقابلِ انکار اصول جس پر مسلمانوں کا سوادِ اعظم ایمان رکھتا ہے، مغرب کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں، بلکہ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا سیاست کو مذہب کے تابع بنانے کا رجحان نظری اور تاریخی حیثیت سے عالمِ اسلام کے لیے درست ہے اور یہ کہ اسے عملاً برتا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؛ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے اس بحث کو ہم اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ:

(۱) کیا اسلام کی ساخت اس قسم کی ہے کہ وہ فی الواقع اپنے پیروکاروں سے مذہبی اخلاقیات کے مجموعی تصور میں رہتے ہوئے ایک متعین سماجی اور سیاسی طرزِ عمل یعنی

سیاسی نوعیت کی سماجی سرگرمیوں کا ایک مقررہ راستہ اختیار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے یا وہ اس عمل اور رویّے کو افراد کی پسند اور ناپسند پر چھوڑتا ہے ؟

(۲) کیا اسلام کی سماجی و سیاسی تعلیمات اتنی ٹھوس اور قابلِ عمل ہیں کہ مسلمان بیسویں صدی کے ماحول میں رہتے ہوئے ان کی اساس پر ایک حقیقی نظمِ مملکت کا تصور قائم کرسکیں؟

(۳) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو کیا موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات اب بھی اس حد تک جاندار ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس سمت میں مؤثر اور قوی جدوجہد کرنے پر آمادہ کرسکیں جو ان کا مقتضا ہے ۔

آخری سوال کا ایک جامع جواب عالمِ اسلام کی موجودہ ذہنی، سیاسی اور جذباتی صورتِ حال کا ایک اندازہ پیش کرسکے گا اور اس اندازے سے مستقبل میں جو تغیرات رونما ہونے والے ہیں ان کے متعلق بھی پیش گوئی کی جاسکے گی ۔ تاہم چونکہ اس طرح کا اندازہ اور پیش گوئی اس مضمون کے دائرۂ بحث سے کہیں آگے نکل جائے گی اس لیے میں سردست اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتا ، لیکن یہ میں بہر حال کہہ سکتا ہوں کہ چالیس سال تک ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان رہ کر مجھے یہ یقین ہوگیا ہے کہ اسلام اس دَور میں بھی فی الحقیقت ایک زبردست زندہ قوت ہے اور کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں وہ روح پھونک سکتا ہے جس سے اقوام کی تقدیریں بدل جاتی ہیں ۔ میرے اس ذاتی یقین کو ادھر چند برسوں میں قیامِ پاکستان سے تاریخی تقویت پہنچی ہے جو ایک مسلم ریاست ہے اور جس کی بنا قومی اور ثقافتی ہم آہنگی کے بجائے تمام تر اسلامی نظریے پر رکھی گئی ہے ۔ اس طرح سے اس ملک کا قیام باشندگانِ ملک کی اس آرزو کی زندہ شہادت ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظام حاصل کیا جائے جس میں اسلام کا آفاقی تصور عملاً پھل پھول سکے ۔ رہی یہ بات کہ پاکستانی عوام نے جس کارِ عظیم کا بیڑہ اٹھایا ہے ، اس سے وہ عہدہ برآ ہوں گے یا نہیں تو اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرسکتا ہے ۔ اس باب میں کوئی قیاس آرائی ، تخمینے اور پیش گوئی کی ایسی

قبیل میں جا داخل ہو گی جس سے پرہیز کرنے کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اس لیے میں اپنے پیش کردہ باقی کے دو سوالات پر روشنی ڈالنے سے زیادہ کچھ نہیں کروں گا۔ یعنی اولاً: کیا اسلام فی الحقیقت یہ چاہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی اعتقادات اور اس کے عملی معاشرتی معاملات ایک دوسرے سے مربوط اور متاثر ہوں؛ اور ثانیاً: کیا شریعت فی الواقع ایک ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر ایک جدید ریاست کی تشکیل کی جا سکے؛ دین و سیاست کا باہمد گر گہرا تعلق جو اسلامی تاریخ کا طرۂ امتیاز ہے اہلِ مغرب کو ایک اصولِ موضوعہ کے طور پر، اجنبی سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک مدت سے "عقیدے" اور "عمل" کو دو مختلف اقالیم کے اقامت گزین مانتے چلے آئے ہیں۔ دوسری طرف جب تک کہ اس مسئلے پر پوری طرح غور نہ کیا جائے، اس وقت تک اسلام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ سب سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جتنی شدت سے بندے اور خدا کے تعلق پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، اسی شدت سے بندے اور بندے کے تعلق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن مجید اپنے پیغام کی ابتدا چونکہ اس بنیادی نظریے سے کرتا ہے کہ فطری زندگی کے تمام پہلو مرضی الٰہی کے پابند ہیں اور اپنی ایک اخلاقی قدر و قیمت رکھتے ہیں، اس لیے اسلام اپنے آپ کو محض روحانی ارشاد و ہدایت تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ انسانی افعال و اعمال کے پورے دائرۂ کار سے بحث کرتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ نقطۂ نظر سرے سے زندگی کے دینی اور دنیاوی معاملات کی تقسیم ہی کو خارج از امکان بنا دیتا ہے اور اس طرح جو "قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو" کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ از روئے قرآن دینِ حنیف کا مقصود ہی یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کے رویے پر اس طرح اثر انداز ہو کہ پورے معاشرے کے اخلاقی طرزِ عمل، خارجی قواعد و ضوابط اور اس کے سماجی و سیاسی دستور و آئین میں مثالی راست بازی کا ظہور ہو۔

وہ یہ نہیں کہتا کہ اسلام میں عیسائیت کی طرح دین کا مخاطب اساسی فرد ہے نہ کہ افراد

کا وہ خارجی اجتماع جس کو ہم معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ اسلام سماجی ماحول سے فرد کی وابستگی کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ پیش نظر رکھتا ہے۔ انسان کسی خلا میں زندگی بسر نہیں کرتا ہے۔ روحانی بالیدگی اور فطری صلاحیتوں کے بہتر استعمال کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھی انسان اس کے پاسبان اور مددگار بنیں۔ اس طرح ایک معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات، اور ان سے معاشرے کی جو ظاہری تشکیل ہوتی ہے وہ دونوں مل کر اُس معاشرے کے ہر فرد کی رُوحانی نشو و نما میں براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ معاشری قانون سازی اُس روحانی راست روی کے لیے ایک ناگزیر لازمہ ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا گیا ہے۔

اس مقصد کی خاطر شریعت ایسے واضح سماجی اور اقتصادی قوانین وضع کرتی ہے جو ایک طرف تو معاشرے کے تمام افراد کے لیے آگے بڑھنے کے یکساں مواقع کی ضمانت دیتے ہیں اور دوسری طرف کمزور کو طاقت ور کی اقتصادی دھاندلی سے بچاتے ہیں۔ انفرادی حقوقِ ملکیت نہ صرف یہ کہ تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ انہیں سماجی طور پر مطلوب اور اخلاقی لحاظ سے حق بجانب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تحفظ ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی قرآن مجید اس بات کی تصریح کر دیتا ہے کہ آخر کار ہر شے کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اس سے استفادے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ نہ اس سے اصل شے کو نقصان پہنچے نہ من حیث المجموع معاشرے کا مفاد اس سے متاثر ہو۔ نتیجتاً انفرادی ہاتھوں میں حد سے زیادہ دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مجموعۂ قوانین اس غرض کے لیے بنایا گیا ہے کہ افراد کے پاس جو دولت جائز ذرائع سے جمع ہو وہ بھی افراد کے علاوہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لیے نفع بخش ہو۔ اس قسم کے چند قوانین چونکہ معاشیات میں اسلام کا نادر المثال اضافہ ہیں، اس لیے ہمیں خاص طور پر ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ جن قوانین کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں ان میں ایک تو لازمی دینی ٹیکس کا وہ قانون ہے جس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جاری ٹیکس ہے جو مقررہ شرح کے ساتھ بیک وقت آمدنی اور سرمایے پر عائد ہوتا ہے۔

ایک اسلامی حکومت یہ ٹیکس دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ وصول کر سکتی ہے جو ضروری سمجھے جائیں۔ دوسرے میت کے رشتے داروں میں ترکے کی لازمی تقسیم، جس کی حقدار صرف اس کی اولاد ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی (یا بیویاں)، ماں باپ اور بھائی بہنیں بھی ہیں۔ تیسرے اس سرمائے پر سُود کے لین دین کی قطعی ممانعت، جو قرض لیا یا دیا گیا ہو، خواہ زیادہ ہو یا کم۔ چوتھے ہر قسم کے قمار کی ممانعت۔ اس میں تجارتی سٹہ، اجارہ داری اور قابلِ فروخت اشیاء کی ذخیرہ اندوزی بھی شامل ہے۔ پانچویں، مزدور کا یہ حق کہ وہ اپنے آجر کے کاروبار کے منافع میں سے بقدر حصہ رسدی وصول کرے۔ چھٹے یہ کہ تمام زمین اصلاً خدا کی ملکیت ہے۔ زمیندار اس سے نفع اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے خود کاشت کرے یا براہ راست اس کا انتظام کرے۔ اس حکم کو اگر پوری طرح ملحوظ رکھا جائے تو تمام بڑی بڑی جاگیریں از خود ختم ہو جائیں گی، سوائے ان کے جو امدادِ باہمی کے اصول پر قائم ہوں۔ اس طرح وہ جاگیرداری نظام بھی خلافِ قانون قرار پائے گا جس میں ایک زمیندار دوسروں کی محنت کا پھل بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گھر بیٹھ کر کھاتا ہے۔

"پوری طرح ملحوظ رکھنے" کی جو شرط میں نے ابھی ابھی لگائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے مسلمان اس پہلو سے غفلت برتتے رہے ہیں اور بیشتر مسلم ممالک کی اقتصادی بدحالی کا اصل سبب بھی جائدادِ ارضی کا چند ہاتھوں میں جاگیردارانہ ارتکاز ہے جس کا نتیجہ سینکڑوں بندگانِ خدا کے اقتصادی استحصال کی صورت میں نکلتا ہے۔ بہرحال یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس وقت ہم شریعت کے احکام کا تذکرہ کر رہے ہیں، نہ کہ اِن احکامات کی اُن خلاف ورزیوں کا جن کا ارتکاب ماضی و حال کے مسلمان کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ، اسلام کی رُوح سے معمور اور اس کے احکام کی تابع ایک سوسائٹی کے قیام کی آرزو، جو سینکڑوں مسلمانوں کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے، اپنے دامن میں اس حقیقت کی واضح شہادت رکھتی ہے کہ نہ صرف انہیں اپنی کوتاہیوں کا پورا شعور ہے بلکہ وہ صدیوں سے دینی اور معاشرتی انحطاط کی جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے نکلنا بھی چاہتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جس قسم کا تمدّنی نظام اسلام تجویز کرتا ہے، وہ محض روحانی ارشاد کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا۔ چنانچہ اسلام اپنی مخصوص حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے جو انسان کی روحانی قوتوں کے ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ایک ایسی متعین سیاسی ہیئت کا مطالبہ کرتا ہے جو سنت کی مقرر کردہ معاشرتی حدود کا تحفظ کرے۔ بالفاظ دیگر "حقیقی اسلامی ریاست"، اسلام کے معاشرتی نظام کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی نظر میں ایک اسلامی ریاست کی صورت کیا ہونی چاہیے اور اس کے فرائضِ منصبی کیا ہوں؟ اس ضمن میں آگے بڑھنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کی اصطلاح کا وہ مفہوم واضح کردوں جس مفہوم میں، میں اس وقت یہ اصطلاح استعمال کر رہا ہوں۔ میں پورے شعور کے ساتھ اس اصطلاح کو قرآن مجید اور سنتِ ثابتہ کے غیر مبہم احکامات تک محدود کرتا ہوں یعنی قرآن و سنت کے وہ فرامین جو قانونی انداز میں صادر ہوتے ہیں۔ جن میں کسی فعل کا حکم دیا گیا ہے، یا کسی فعل سے روکا گیا ہے، یا کسی امر کی تحسین کرتے ہوئے اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، یا کسی امر کی مذمت کرتے ہوئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمام معاصر مسلمان اسلامی قانون کے دائرۂ کار کو اس طرح محدود کر دینے پر مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے۔ ان میں سے بیشتر کی رائے میں اسلامی قانون کو محض قرآن و سنت کے واضح احکامات تک ہی محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے نزدیک اسلامی قانون میں پہلی تین چار صدیوں کے علماء کے ان فتاویٰ کا اضافی نظام بھی شامل ہے جن تک ان کی رسائی مختلف استخراجی مراحل طے کرنے کے بعد ہوئی ہے۔ اصلاً یہ فتاویٰ متعین مسائل اور قانونی اشکالات پر قرآن و سنت کے احکام کے انطباق میں آسانی پیدا کرنے کے لیے دیئے گئے تھے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ فتاویٰ بذاتِ خود اعزاز و اتباع کے اسی درجے کو پہنچ گئے جس درجے پر قرآن و سنت کے احکامات فائز ہیں اور بہت سے مسلمانوں نے انہیں اسلامی قانون کا جزو لاینفک سمجھنا شروع کر دیا۔ اس نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قرآن و سنت کے

احکام تنہا تمام ممکنہ قانونی مسائل کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے قیاس و استنباط کے ذریعہ سے مجموعۂ قوانین میں توسیع ضروری ہے۔ لیکن ایک شخص بالکل بجا طور پر یہ استدلال کر سکتا ہے، جیسا کہ مسلمان علماء کی ایک معقول تعداد مدت دراز سے استدلال کرتی آ رہی ہے کہ اصل اسلامی قانون کے دائرۂ کار کے محدود ہونے کا سبب (والعیاذ باللہ) شارع کی چوک نہیں تھی بلکہ اس کا اصل سبب قانونی اور معاشرتی جمود کے خلاف ایک ناگزیر تحفظ بہم پہنچانا تھا۔ اس کی منشا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایسے اخلاقی حدود کھینچ دے جن میں رہتے ہوئے معاشرہ پھل پھول سکے۔ اور وقتاً فوقتاً جو قانونی مسائل پیدا ہوتے رہیں، انہیں بعد کی نسلوں کے فیصلوں پر چھوڑ دیا جائے —— ایسے فیصلے جو کتاب و سنت کی روشنی میں وقت اور بدلتے ہوئے معاشری حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کیے جائیں۔

اسلامی قانون کا یہ تصور کوئی انوکھا اور اچھوتا تصور نہیں ہے۔ سلف میں چند ممتاز مسلمان ماہرینِ قانون نے قریب قریب یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ جن میں سرِ فہرست علامہ ابن حزم اندلسی (۹۹۴ء-۱۰۶۴ء) ہیں۔ موجودہ زمانے کے بھی اکثر و بیشتر علماء اسی طرزِ استدلال کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی یہ قرار دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے غیر مبہم احکام بلاشبہ ناقابلِ تغیر و تبدل اساسی اسلامی قانون کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نافذ رہنے چاہییں لیکن اس شرعی قانون کے ساتھ ہی ساتھ، مسلمانوں کو اجازت کیا معنی، واضح طور پر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسا تغیر پذیر قانون تیار کریں جو الٰہی قانون کی روح اور اس کے احکامات کو وقتی معاشری تقاضوں پر منطبق کرے۔

اس زاویے سے جب ہم اسلامی قانون کے مسائل پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے دو نتیجے ابھر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طرح شرعی قانون وہ لچک حاصل کر لیتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے بنیادی قانونی ڈھانچے میں سراسر ناپید ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک اسلامی ریاست کی صورت اور اس کے فرائضِ منصبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ

وہ تاریخی تطابق کا پورا عکس ہوں، اور یہی امر ایک اسلامی ریاست کے مسائل سے سب سے زیادہ متعلق ہے۔ ایک ریاست سے "صحیح اسلامی ریاست" کہلانے کے لیے جو کچھ مطالبہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے دستور اور اس کے افعال میں قرآن وسنت کے واضح احکامات کا جن سے معاشرے کی سیاسی زندگی براہِ راست متاثر ہوتی ہے، پوری طرح ظہور ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کے اس طرح کے احکامات کا دائرۂ اثر پوری طرح واضح ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے احکامات ان معاشری واقتصادی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت وسیع میدان کھلا چھوڑ دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ حکم "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" دلالت کرتا ہے کہ حکمرانی کی سند بہر حال قرآن وسنت سے حاصل کی جانی چاہیے اور مسلمان معاشرے کے ایک رکن ہی کے قبضے میں رہنی چاہیے۔ بالفاظِ دیگر ایک مسلمان ہی سربراہ مملکت ہو سکتا ہے۔ یہ شرط اسلامی ریاست کی اس خصوصیت کی وجہ سے لگائی گئی ہے کہ اس ریاست کی بنیاد ایک خاص نظریے پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کو شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ سیاجی

زندگی کے تمام شعبے غیر مسلم شہریوں کے لیے بھی اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح مسلم شہریوں کے لیے۔ وہ مساوی حقوق کے مالک ہیں اور انہیں اپنے سماجی، مذہبی اور ثقافتی مفادات کا یکساں تحفظ حاصل ہے۔

یہ چیز ہمیں ایک صحیح اسلامی ریاست کے دستور کے ایک اور مہتم بالشان نکتے تک لے جاتی ہے، یعنی نظم ونسقِ سلطنت کا وہ اصول جس کا اظہار قرآنی الفاظ میں "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" سے کیا گیا ہے۔ حکومتی مشینری کو جو شکل بھی دی جائے، اگر حکومت کا انحصار رضامندیٔ جمہور پر نہیں ہے اور وہ جمہوری رجحانات کی آئینہ دار نہیں ہے تو اسے "اسلامی" ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن مجید میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکامات

وقتاً فوقتاً دیئے ہیں ان کی رو سے انتظامیہ اور مقننہ کا قیام بذریعہ انتخاب عمل میں آنا چاہیے اس انتخاب کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے، اور یہ کتنی مدت کے لیے ہونا چاہیے، ان سوالات کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ہر زمانے اور ہر ہیئتِ اجتماعی کی اپنی ضروریات کے لیے وسیع تر میدان موجود رہے۔ جو لوگ سیاست کو بغرضِ نشاط استعمال کرتے ہیں یا جنہوں نے اسے بطور پیشے کے اپنایا ہے، ان کی روک تھام کے لیے امیدواری کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعیت کے ساتھ ممنوع کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ امیدوار ہونا غلط ہے بلکہ جو شخص اپنے حق میں کسی عہدے کی خاطر رائے ہموار کرے وہ از خود نااہل قرار پاجائے گا۔

میں نے تھوڑی دیر قبل ذکر کیا تھا کہ اسلام کے اس قانون کے ساتھ جو نصوص سے ثابت ہے اور جس کو ایک اسلامی دستور کی بنیاد کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہنا چاہیے، ایک مسلسل اور تغیر پذیر اضافی قانون سازی بھی ہونی چاہیے جو ان معاملات سے متعلق ہو، جن کے بارے میں کوئی حکم یا تو قانونِ شریعت نے بالکل نہیں دیا، یا دیا بھی ہے تو محض اجمالی طور پر۔ روزمرہ کی قانون سازی کا یہ فرض ایک منتخب پارلیمانی ادارہ اس مفروضہ پر انجام دے گا کہ اسلام کا اساسی قانون، قانونِ اعلیٰ کی حیثیت سے موجود رہے گا اور کوئی قانون اس قانونِ اعلیٰ کے الفاظ اور روح کے منافی نہیں ہو گا۔

دوسرے الفاظ میں ایک اسلامی ریاست میں روزمرّہ کی قانون سازی کا پہلا کام یہ ہے کہ ایسا سیاسی ڈھانچہ تیار کرے جس میں اساسی قانون پوری طرح روبعمل آسکے۔ دوم یہ کہ معاشرے کے معاشی و سیاسی مفادات کی اندرونی و بیرونی خطرات سے حفاظت کرے اور سوم یہ کہ ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جس میں ہر شہری کو پورا روحانی اور جسمانی تحفظ حاصل ہو۔ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ"[1] کے مطابق ریاست کو لازمی اور مفت تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے اسی طرح

---

[1] ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ (مترجم)

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لیس المومن الذی یشبع و جارہ جائع الی جنبہ[1] کی روشنی میں ریاست ہر شہری کو وسائل حیات مہیا کرنے کی براہِ راست ذمہ دار ہے۔ غرض جدید اصطلاح میں اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے جس میں افراد کے مفادات بحیثیت مجموعی معاشرے کے مفادات کے تحت جگہ پاتے ہیں۔

اسلام اس بات کو بھی صاف کر دیتا ہے کہ معاشرے کے مفادات فی نفسہ برتر نہیں ہیں، بلکہ ان کی فوقیت مشروط ہے، ان اخلاقی حدود سے جو قرآن مجید نے انسان کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی نظر میں عصبیت جاہلیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی غلط کام میں اپنی قوم کی حمایت کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے"[2]

یہ فرمان قوم پرستانہ تعصب کی تمام اقسام کی نفی کر دیتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ بذاتِ خود قوم پرستی کی بھی نفی کر دیتا ہے جس کی مذمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من دعا الی عصبیۃ ولیس منا من قاتل عصبیۃ ولیس منا من مات علی عصبیۃ[3]

الغرض اگر قرآن وسنت کے آئینے میں اسلامی ریاست کا عکس دیکھا جائے تو وہ خالصتاً ایک نظریاتی مملکت نظر آئے گی جس میں نسلی اور قومی ترجیحات اور وفاداریوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوگی جس میں تمام تر سرگرمیاں اخلاقی نقطۂ نظر کی حامل ہوں گی، نہ کہ مصلحت کوشیوں کی۔

یہ سب کچھ ہے تو بڑا پرکشش، لیکن کیا ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش تضیاً لیسی

---

[1] وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو (مترجم)

[2] فاضل مصنف نے حدیث کا ترجمہ بلا حوالہ درج کر دیا ہے، ہم باوجود کوشش کے اصل الفاظ تلاش نہیں کر سکے۔

[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے اور وہ بھی نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مرے (مترجم)